مذہبی انتہا پسندی اور عصرِ حاضر میں فرقہ واریت کے اسباب اور سدِباب

Religious Extremism in Contemporary Era: Causes and Solutions

ڈاکٹر جنید اکبر *

حافظ محمد یونس **

Abstract

The phenomenon of sectarianism and religious extremism in various forms and manifestations is present in our society. There are internal as well as external factors. The most important among the internal factors of sectarianism and religious extremism are the extreme positions of religious parties and preachers, personality-cults, egoism, sectarian bias, the concept of being the only righteous person, considering the others as misguided, converted, atheists and infidels, disrespecting religious exponents and figures of the other sects, delivering provocative and inflammatory speeches and spreading such literature. These factors are contributing to the spread of sectarianism and religious extremism. Another important reason behind the spread of sectarianism and religious extremism is the ineffective role of the moderate religious political parties and elites for not countering the exterimists' narrative which encourage them. Besides, liberal forces that target Islam, moderate religious political parties and elites, further add fuel to religious extremism. To eliminate extremism it is important to not only enforce stringent laws, but also to address the reasons behind it. This paper attemptsto highlight the factors behind religious extremism and recommends ways and means to address the menace.

Keywords: Religious Extremism in Pakistan, Causes of Religious Extremism, Fatwā, Sectarianism.

شدت پسندی، انتہا پسندی اور مذہبی فرقہ واریت ایک عالم گیر مسئلہ بن چکا ہے۔ تقریباً ہر مذہب کے ماننے والوں میں انتہا پسند عناصر موجود ہیں، لیکن عالمی سطح پر جن ممالک میں انتہا پسندی کا ذکر کیا جاتا ہے ان میں پاکستان بھی سرِفہرست ہے۔ پاکستان میں فرقہ واریت، شدت اور انتہا پسندی کے مختلف اسباب ہیں۔ پاکستان مخالف اور شدت پسند عناصر ان اسباب کا فائدہ اٹھا کر بالخصوص نوجوان نسل کو گمراہ کر کے شدت اور انتہا پسندی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ جس سے معاشرے میں نہ صرف فساد پھیلتا ہے اور عالمی سطح پر وطنِ عزیز کو بدنام کیا جاتا ہے، بلکہ معاشرہ اور ملک ان نوجوانوں کی مثبت اور تعمیری صلاحیتوں کے فوائد سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ شدت اور انتہا پسندی کا خاتمہ محض ان کے بارے میں سخت قوانین بنانے سے ممکن نہیں ہے، بلکہ اس کے اسباب کی نشاندہی کر کے ان کو ختم کرنے کی کوششوں سے ہی ممکن ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں چند ایسے اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے مذہبی فرقہ واریت، شدت اور انتہا پسندی پھیلتی ہے۔ ان میں ایک غلو فی الدین بھی ہے۔

غلو فی الدین:

عصرِ حاضر میں فرقہ واریت اور انتہا پسندی کا ایک اہم سبب غلو فی الدین بھی ہے۔ دین میں غلو سے مراد دینی احکامات چاہے ان کا

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ و دینیہ، جامعہ ہری پور

** ایم فل سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ و دینیہ، جامعہ ہری پور

تعلق عقائد سے ہو یا عبادات و دیگر معاملات سے ہو، ان میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ غلو کے معنیٰ کسی چیز کے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں [1]۔ مولانا ابو الکلام آزادؒ نے غلو کی نہایت جامع تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"حقیقت و اعتدال سے متجاوز ہو کر بہت دور تک چلے جانا۔ اگر کسی کی محبت و تعظیم پر آئے تو اتنی تعظیم کہ اسے خدا کے درجے تک پہنچا دیا۔ مخالفت پر آئے تو اتنی مخالفت کی کہ اس کی صداقت ہی سے انکار کر دیا۔ اگر زہد و عبادت کی راہ اختیار کی تو اتنی دور تک چلے گئے کہ رہبانیت تک پہنچ گئے"[2]۔

اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحیؒ غلو کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"غلا، یغلو کے معنیٰ بڑھنے، زیادہ ہونے، متجاوز ہونے کے ہیں۔ جس طرح مذہب کے معاملے میں تفریط بہت بڑا جرم ہے اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے مذہب کا وہ مزاج جو سراسر اعتدال ہے بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یوں تو اس غلو میں تمام اہلِ مذاہب مبتلا ہوئے۔ یہاں تک ہم مسلمان بھی جن کو عدل و قسط پر قائم رہنے کی سب سے زیادہ تاکید ہوئی ہے اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے"[3]۔

چنانچہ قرآن و حدیث میں بھی ہر قسم کے غلو سے منع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **"لا تغلوا فی دینکم "**[4] "اپنے دین میں غلو مت کرو"۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے:

"و ایاکم و الغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین"[5]

"اور تم خاص طور پر دین میں غلو (انتہا پسندی) سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کی بنا پر ھلاک ہو گئے"۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"ھلک المتنطعون قال لھا ثلاثاً"[6]

"کہ دین میں غلو اختیار کرنے والے یعنی حد سے تجاوز کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی"۔

اسلام نے دین کے ہر شعبے میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے اور غلو سے منع کیا ہے اور اسے ھلاکت کا سبب قرار دیا ہے، لیکن اسلام کی ان واضح ہدایات اور تعلیمات کے باوجود ہمارے معاشرے میں غلو فی الدین یعنی شدت پسندی اور انتہا پسندی کے رجحان پائے جاتے ہیں جس نے مذہبی فرقہ واریت اور تقسیم میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولانا محمد تقی امینیؒ لکھتے ہیں:

"الٰہی شریعت میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں توازن و ہم آہنگی برقرار رہے ورنہ افراط و تفریط کی صورت میں ایک طرف غلو اور تقشف کی زندگی نمودار ہو گی تو دوسری طرف آزادی اور بے راہ روی کی زندگی کو فروغ حاصل ہو گا، اور یہ دونوں راہیں شریعت کے جادہ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں۔ مسلم قوم کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ اس سے عدل و توازن رخصت ہو گیا ہے، ایک طرف دین اور دنیا کی تقسیم نے اسلام کو دوسرے مذہبوں کے مشابہہ بنا دیا ہے اور دوسری طرف جماعت سازی

وگروہ بندی نے اس زعم فاسد میں مبتلاء کر دیا ہے کہ حق وہی ہے جو وہ کہتا ہے۔ صحیح کا وہی ہے جو وہ کرتا ہے، صالح وہی ہے جو اس کی جماعت میں ہے اور داعی وہی ہے جو اس کی جیسی بات کرتا ہے "[7]۔

یہ سوچ اور فکر کسی ایک مکتبہ فکر اور مسلک میں ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ تمام مسالک اور جماعتوں میں کسی نہ کسی سطح پر یہ سوچ موجود ہوتی ہے کہ اس کا عمل اور طریقہ کار دوسروں سے افضل اور بہتر ہے۔

مسلکی اور جماعتی غلو:

پاکستانی معاشرے میں غلو فی الدین کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں جن میں عقائد، عبادات اور رسوم وغیرہ میں غلو بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، لیکن ان میں مسلکی اور جماعتی غلو فرقہ واریت اور انتہا پسندی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اگرچہ بیشتر دینی جماعتیں جو اپنے اپنے طریقہ کار کے مطابق کام کر رہی ہیں۔ اپنی اپنی جگہ مفید خدمات انجام دے رہی ہیں، اور ان میں بہت سے علماء اور مخلص لوگ کام کر رہے ہیں۔ اگر یہی جماعتیں متحد ہو کر تقسیم کار کے ذریعے باہم تعاون کرنے لگیں اور اقامت دین کے مشترکہ مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری جماعت کو اپنا دست و بازو سمجھے اور دوسروں کے کام کی بھی ایسی ہی قدر کریں جیسا وہ اپنے کام کی کرتی ہیں۔ تو یہ جماعتیں اپنے الگ الگ نظام میں رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں۔ مگر عموماً ہو یہ رہا ہے کہ ہر جماعت نے اپنی سعی اور عمل کا جو دائرہ بنالیا ہے وہ خدمت دین کو بس اسی دائرے میں منحصر سمجھتے ہیں۔ مفتی محمد شفیعؒ اس جماعتی غلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مگر اس میں علمی غلو تقریباً ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظام عمل کو مقصد منصوص کا درجہ دے دیا گیا۔ جو شخص اس نظام عمل میں شریک نہیں، اگرچہ مقصد کا کتنا ہی عظیم کام کر رہا ہو اس کو اپنا بھائی، اپنا شریک کار نہیں سمجھا جاتا اور اگر کوئی اس نظام عمل میں شریک تھا، پھر کسی وجہ سے اس میں شریک نہ رہا تو عملاً اسے اصل مقصد اور دین سے منحرف سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامت دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے، اس غلو کے نتیجہ میں وہی تحزب و تعصب اور گروہ بندی کی آفتیں اچھے خاصے دین دار لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں جو جاہلی عصبیتوں میں مبتلا لوگوں میں پائی جاتی ہیں"[8]۔

اگر غلو کی صورت صرف یہ ہو کہ کوئی مسلک اور جماعت اپنے عمل اور طریقہ کار کو دوسروں سے افضل سمجھے مگر دوسروں کی رائے اور عمل کو بھی احترام کی نظر سے دیکھے تو اس سے کوئی انتشار اور فساد نہیں پھیلتا اور نہ ہی اس سے مذہبی فرقہ واریت اور انتہا پسندی پیدا ہوتی ہے جس کا اس وقت ہمارے معاشرے کو سامنا ہے، لیکن جب یہ فکر پروان چڑھنے لگے کہ حق پر صرف وہی ہیں اور دوسروں کو بھی اسی حق کی دعوت دینے لگیں تو اس سے فتنہ اور فساد پھیلتا ہے۔ جیسا کہ مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

"ان میں بعض حضرات کا غلو تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کی نماز کو فاسد اور ان کو تارک قرآن سمجھ کر اپنے مخصوص مسلک کی اس طرح دعوت دیتے ہیں جیسے کسی منکر اسلام کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو۔ اور اسی کو دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھے ہوئے ہیں"[9]۔

اسی طرح بعض جماعتیں جو دین کے کسی خاص شعبے میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان میں یہ غلو پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دیگر شعبوں کے بارے میں وارد فضائل کو بھی اپنی جماعتی دعوت پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مفتی مختار الدین شاہ لکھتے ہیں:

"بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ آج ہر دینی کام کرنے والے بعض حضرات میں سیاسی رقابتوں کا سا مزاج پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی ہی جماعت کو برحق سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے شعبوں میں ان کا انہماک و توغل اس درجہ بڑھا ہوتا ہے کہ اپنے شعبوں کی حمایت کے لئے دیگر اعمال کے بارے میں آنے والے فضائل کو بھی لے لیتے ہیں اور انہیں اس وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ گویا ان فضائل کا ورود اور نزول انہی کے شعبے کے لئے ہوا ہے جس سے اصلی اشیاء کی اہمیت ہٹ جاتی ہے اور ان کے فضائل نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں"[10]۔

وہ تمام افعال جو فی نفسہ تو جائز ہیں مگر ان کی ترتیب یا وقت میں اختلاف ہے، جیسا کہ پاکستان میں مروج رسوم و بدعات ہیں، کہ ان میں سے بیشتر میں اختلاف ترتیب اور وقت کا ہے۔ مثلاً مساکین کو کھانا کھلانا سب کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اس میں اختلاف دن کی تخصیص کا ہے، بلا تخصیص یوم اور تعین وقت سب کے نزدیک جائز اور باعث اجر و ثواب ہے۔ اسی طرح دعا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر دونوں شریعت میں مطلوب ہیں، لیکن جنازہ کے بعد دعا یا سنت اور نوافل کے بعد اجتماعی دعا اور نماز کے بعد جہری ذکر سبب اختلاف ہے۔

لہٰذا اس سلسلے میں یہ اصول اختیار کیا جائے کہ ایسا کرنے والوں پر نکیر نہ کی جائے اور نہ ان سے بحث و مباحثہ میں الجھا جائے۔ اسی طرح ان کے قائلین کو بھی چاہیے کہ جو چیز ان کے عقیدے کے مطابق بھی فرض اور واجب نہیں ہے اور وہ اختلاف اور فساد کا سبب بن رہی ہے تو اس کے کرنے پر اصرار نہ کریں اور اس کو باعث نزاع نہ بنائیں۔ اور اس سلسلے میں یہ اصول اپنائیں جو فقہ حنفی کی معتبر کتب فقہ میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"اذا تردد الحکم بین سنت و بدعة کان ترک السنة راجحاً علی فعل البدعة"[11]

"جب کسی حکم میں تردد ہو جائے کہ یہ سنت ہے یا بدعت ہے تو سنت کا ترک کر دینا بہ نسبت بدعت کے کرنے کے راجح ہے"۔

اس قاعدے سے ان تمام امور کا حکم معلوم ہو جاتا ہے جس کے سنت و بدعت ہونے میں اختلاف ہو بعض اسے سنت بتاتے ہوں اور بعض اسے بدعت کہتے ہوں۔

قطعیت کا تصور:

عصر حاضر میں اختلافات، فرقہ واریت اور شدت پسندی کا ایک سبب قطعیت کا تصور اور احساس یعنی یہ سوچ بھی ہے کہ حق اور درست بات صرف وہی ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔ اور درست رائے وہی ہے جو اس کے مسلک کے علماء کی ہے۔ اس میں غلطی یا خطا کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ اور دوسرے کی بات اور تاویل درست نہیں ہے۔ حالانکہ پہلے زمانے میں ائمہ کرام اپنے مسلک و موقف کو حق سمجھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی گمان رکھتے تھے کہ دوسرے فریق کی بات بھی درست اور صحیح ہو سکتی ہے، اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ:

"مذھبنا صواب یحتمل الخطاء و مذھب غیرنا خطاء یحتمل الصواب"[12]

"کہ ہمارا مذہب (اس مسئلہ میں) ہی درست ہے اگرچہ اس میں غلطی کا امکان بھی ہے، اور دوسرے فریق کا مذہب خطا ہے اگرچہ اس میں بھی درستگی کا احتمال ہے"۔

عصر حاضر میں ہر فریق قطعیت کے ساتھ یہی موقف رکھتا ہے کہ ان کا مسلک ہی درست ہے اور اس میں خطا کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ اور دوسرے فریق کا مسلک درست نہیں ہے اس میں درستگی کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ یعنی یہ چیز اب پہلے زمانے کے برعکس ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے ادوار میں مسائل میں کثرت سے اختلافِ رائے کے باوجود باہمی محبت و الفت، اور رواداری میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، لیکن آج عموماً صورتحال اس کے برعکس ہے۔ لہٰذا اگر ہر فریق اپنے آپ کو قطعی طور پر حق پر سمجھے اور دوسرے فریق کو قطعی طور پر باطل پر تصور کرے اور اس کے بعد اگر اتفاق و اتحاد کی بات بھی کرے تو اس کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہی ہے۔

صحابہ کرامؓ اگر کوئی بات اپنی رائے اور اجتہاد سے کہتے تو بھی اس پر اصرار نہ کرتے اور اپنے رائے کو حتمی اور قطعی نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ایک موقعے پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کلالہ سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"فان کان حقاً فمن اللہ و ان کان باطلا فمن ابی بکر و من الشیطان"[13]

"اگر یہ صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ خطا ہے تو میری طرف سے ہے اور شیطان کی طرف سے ہے"۔

اسی طرح ایک موقعے پر حضرت عمرؓ نے اپنے ایک فیصلے کے بارے میں فرمایا:

"و اللہ مایدری عمر، ان ھذا ھو الصواب او الخطاء"[14]

"اللہ کی قسم! عمر نہیں جانتا کہ یہ درست ہے یا غلط ہے"۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور ائمہ اور مجتہدین اگر کسی وقت یہ محسوس کرتے کہ انکی رائے درست نہیں ہے تو وہ فوراً اس سے رجوع کر لیتے۔ اور کبھی اپنی رائے کو قطعی اور حتمی تصور نہیں کرتے تھے۔ لیکن عصر حاضر میں تعصب اور ضد کی وجہ سے کوئی اپنی رائے سے رجوع کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور اپنی رائے کو ہی قطعی اور حتمی تصور کرتا ہے۔ کسی شرعی مسئلہ میں رائے سے رجوع کرنے کو کم علمی اور کمزوری کی علامت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ کسی شرعی معاملہ میں کشف حقیقت کے بعد رائے سے رجوع رسوخ فی العلم اور تقویٰ کی دلیل ہے۔

تعصب:

قطعیت کے تصور کی وجہ سے عصر حاضر میں فرقہ وارانہ تعصب بہت زیادہ ہے۔ ہر مکتب فکر اور گروہ اپنے مسلک اور گروہ کے بارے میں تعصب کا شکار ہے۔ اس تعصب کی وجہ سے وہ مخالف فریق کے اچھے کاموں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنے فریق کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرتا ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں ایسے تعصب سے منع کیا گیا ہے اور اس کے نقصانات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

"حبک الشئی یعمی و یصم"[15]

"کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے"۔

اس مسلکی تعصب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اختلافِ رائے کو اختلاف فی الدین سمجھ کر اسے کفر اور اسلام کا مسئلہ بنالیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دینی احکام سے بے خبری، جہالت، علمی برتری، فروعی مسائل پر غیر ضروری زور دینا، مسلکی شناخت اور تشخص کو ابھارنا وہ بنیادی اسباب ہیں جو مسلکی تعصب اور فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں اور امت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اگر فروعی مسائل میں اختلافات کی حقیقت سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اخلاص، للّٰہیت، خوفِ خدا اور دیانت کا غلبہ ہو تو اعتدال کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور نہ ہی باہمی نزاع تک نوبت پہنچے۔[16]

اکابر اور انا پرستی:

عصر حاضر کے اختلافات کے اسباب اور اسلوب میں ایک اکابر پرستی بھی ہے۔ اکابر پرستی برصغیر کے ہر مکتب فکر میں پائی جاتی ہے۔ اکابر پرستی کا مطلب ہے کہ اپنے اکابر اور بزرگوں سے محبت و عقیدت میں غلو کرنا اور حق کو صرف انہی میں منحصر سمجھنا۔ ڈاکٹر محمد مظہر یٰسین صدیقی اکابر پرستی اور اس کے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”دین و شریعت، عبادت و ریاضت اور خالص الٰہی طاعات میں اس فطرتی مسابقت نے بڑے اختلافات پیدا کئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مرض اکابر پرستی کا پیدا ہوا ہے۔ ہر ادارہ، مسلک، جماعت اور تنظیم وغیرہ کے اپنے احبار و رھبان ہیں جن کو ارباب بنایا گیا ہے، جو فطرت یہود تھی، وہ اختلاف پسندی اور اکابر پرستی کے سبب علامت مسلم بن گئی ہے۔ ان جماعت کی آستینوں کے اصنام نے قیامت ڈھائی ہے۔ اور اس اصنام پرستی کا تقاضہ علیحدگی اور اختلاف ہے“[17]۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مکتبہ فکر اپنے مسلک اور فکر کے علماء کو ”علماء حق“ اور مخالف علماء کو ”علماء سوء“ قرار دیتا ہے۔ کسی مسلک کے علماء سے چند مسلکی مسائل میں اختلافِ رائے کی بنیاد پر علماء سوء میں ان کو شمار کرنا درست رویہ نہیں ہے۔ جبکہ ان مسائل کا تعلق شریعت کے مسلمہ عقائد اور متفقہ مسائل سے بھی نہ ہو۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ لکھتے ہیں:

> ”لیکن یہ بات کہ فلاں شخص یا جماعت علماء حق میں ہے اور فلاں شخص اور جماعت علماء سوء میں ہے اپنے اختیار میں نہیں ہے، یہ بھی شریعت کی میزان سے معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جو شخص ہماری رائے کے موافق کہے وہ علماء حق سے ہے اور جوں ہی وہ کوئی بات ہماری رائے کے خلاف کہہ دے وہ فوراً علماء سوء کی فہرست میں داخل ہو کر گردن زنی بن جائے“[18]۔

اس انا پرستی کی وجہ سے کئی جماعتیں اور گروہ پیدا ہوئے ہیں اور علماء کی جماعتیں تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر کر غیر مؤثر ہو گئی ہیں، جس کی وجہ سے انتہا پسند عناصر مزید طاقتور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی لکھتے ہیں:

> ”دور متوسط کے یہ اختلافات ہوں یا ہمارے موجودہ زمانہ کے، ان میں بنیادی وجہ نفسانیت اور انا ہے جو مسلکی، ارادی اور جماعتی تعصب اور عناد کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ اس نے ایسے ایسے گل کھلائے ہیں کہ غیروں کے ساتھ اپنوں کے آشیانے پھونک ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تمام دینی، مذہبی اور تعلیمی اور دوسرے ادارے انفرادی و جماعتی انا کے شکار ہیں۔ علماء کی جمعیت تین چار ہیں، ہر مسلک و مکتب فکر کی جمعیت الگ ہے، ان کے

دینی اور تعلیمی ادارے جدا ہیں، ان میں غیر کا داخلہ ممنوع ہے۔ اب تو صورتحال یہ بن گئی ہے کہ ہر ادارہ، ہر جماعت اور ہر مسلک خاندان بنتا جاتا ہے"[19]۔

قرآن کریم نے اکابر اور انا پرستی کے جو اسباب اور نقصانات بیان کئے ہیں۔ اگر عصر حاضر کے اختلافات اور ان کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عصری اختلافات میں بھی وہی اسباب کار فرما ہیں۔ دو مختلف مکاتب فکر کے علماء کے درمیان مسلکی اختلافات اور ان کے اسباب تو سمجھ میں آسکتے ہیں، لیکن ایک ہی مسلک کے علماء کے درمیان مستقل بنیادوں پر اختلاف قائم رہنا جب کہ اس کے کوئی ظاہری بنیادی اسباب بھی نہیں ہوتے، تو اس کی وجہ سوائے انا پرستی کے اور کوئی نہیں ہے۔

اختلافی مسائل پر فتاویٰ:

عصر حاضر میں شرعی مسائل میں اختلافِ رائے کا سبب اور اسلوب اختلافی مسائل پر فتاویٰ کا رجحان بھی ہے۔ عموماً مفتیان کرام ہر طرح کے آنے والے سوالات پر فتاویٰ جاری کر دیتے ہیں۔ فتاویٰ کے بارے میں کسی مفتی کی طرف کثرت سے رجوع اس پر اعتماد کا اظہار اور اس کی مقبولیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور مفتیان بھی ہر طرح کے فتاویٰ جاری کر دیتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ کرام حتیٰ الامکان فتویٰ دینے سے احتراز کرتے تھے، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰؒ کا قول ہے:

"**ادرکت عشرین و مائة من الانصار من اصحاب رسول الله ﷺ ما منهم رجل یسئل عن شیئی الا ود ان اخاه کفاه و لا یحدث حدیثاً الا ود ان اخاه کفاه**"[20]

"میں رسول اللہ ﷺ کے ایک سو بیس انصاری صحابہ سے ملا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک حدیث بیان کرنے والے کی خواہش ہوتی تھی کہ اس کی جگہ کوئی اور بھائی حدیث بیان کر دے اور فتویٰ دے دے"۔

صحابہ کرام کی فتوی نہ دینے اور دوسرے صحابی کی طرف رجوع کا حکم دینے کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتے تھے، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اس بھاری ذمہ داری کو محسوس کرتے تھے اور فتویٰ میں خطا سے ڈرتے تھے۔

بغیر علم اور تحقیق کے فتویٰ دینے والے کو حدیث شریف میں گناہ گار قرار دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"**من افتی بغیر علم کان اثمه علی من افتاه**"[21]

"جو شخص بغیر علم کے فتوی دے تو اسکا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہی ہو گا"۔

مفتی محمد شفیعؒ حافظ ابن قیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ماہر مفتی کا انتخاب اور درصورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتویٰ کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ میں سب سے زیادہ ہو۔ یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے۔ اس کا کام یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی کو ترجیح دے، لیکن یہ اسی کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے لحاظ سے افضل جانتا ہے اس کے فتویٰ پر عمل کرے، مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو بُرا کہتا نہ پھرے۔ ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے، اگر حقیقتاً کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے"[22]۔

مفتیان کرام کا یہ فرض ہے کہ وہ فتویٰ کے اجراء سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لیں کہ اس استفتاء کا پس منظر کیا ہے۔

بعض اوقات فتاویٰ میں ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کے جواب میں بد احتیاطی فتنہ اور فساد کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا مفتیان کرام کو ایسے سوالات پوچھنے والے کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے اور ان کے جواب میں حد درجہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اس لئے مفتی کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ استفتاء کے پس منظر اور اس کے اثرات سے بھی آگاہ ہو۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ:

"من یجهل اهل زمانه فهو جاهل"[23]

اسی طرح السنن الکبریٰ میں ہے:

"من افتی الناس فی کلما یستفتو نه فهو مجنون"[24]

معروف مالکی فقیہ ابو العباس احمد بن ادریس قرافی (م ۶۸۴ھ) لکھتے ہیں:

> "مفتی کو فضول اور لایعنی سوالات کو جواب دینے سے گریز کرنا چاہیے، جب کبھی اس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی شانِ اقدس کے بارے میں کوئی استفتاء آئے یا اس استفتاء کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہو، یا ایسے امور کے بارے میں سوال کیا گیا ہو جن سے واقفیت رکھنا سائل کے حق میں کوئی سود مند نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا شخص جاہل، اجڈ یا کوئی دیہاتی گنوار ہو گا۔ یا مفتی سے دین کی باریکیوں، مشکل، پیچیدہ اور گھمبیر مسائل کے بارے میں سوال کیا جائے یا استفتاء کا تعلق ایسے تشابہات یا مشتبہ امور سے ہو جن کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا صرف بڑے بڑے علماء کی ذمہ داری ہو۔ مفتی قرائن سے سائل کے بارے میں اندازہ لگائے کہ اس طرح کے سوالات پوچھنے کا مقصد فضول اور لایعنی کاموں میں وقت ضائع کرنا ہے لہٰذا ایسے سائل کو ہرگز جواب نہیں دینا چاہیے"[25]۔

پاکستان میں اس طرح کے پوچھے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات تحقیق کا ایک الگ اور مستقل موضوع ہے جس میں پاکستان کے فتاویٰ لٹریچر کا تحقیقی جائزہ لیا جائے کہ ان میں کس کس میں اصول فتویٰ کو مد نظر نہیں رکھا گیا اور حالات و زمانہ کی رعایت نہ کرتے ہوئے اور ان سے عدم واقفیت کی بنیاد پر فتاویٰ جاری کئے گئے۔ حالانکہ:

> "مفتی کے لئے ضروری ہے جب تک استفتاء سے متعلق ایک عام مستفتی کے حقیقی مقصود کو نہ سمجھ لے مستفتی کے ظاہری الفاظ سن کر فتویٰ نہ دے۔ کیونکہ عام لوگ بسا اوقات صریح الفاظ بول کے ایسے معنیٰ مراد لے رہے ہوتے ہیں جو ان الفاظ سے مراد نہیں لیا جا سکتا۔ بعض دفعہ وہ عبارت نہ مستفتی کی ظاہری حالت پر صحیح طور پر منطبق ہو رہی ہوتی ہے اور نہ یہ معنیٰ اس کی کیفیت پر دلالت کر رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا شک و تردد ہوتا ہے۔ اصل صورتحال کیا ہے؟ مفتی کے لئے اس سے آگاہی ضروری ہے۔ صرف استفتاء اور مستفتی کے الفاظ و عبارت پر بھروسہ بھی نہ کرے اور جب حقیقی صورتحال اس کے سامنے منکشف ہو جائے تو پھر اس کے مطابق فتویٰ دے ورنہ شک و تردد کی حالت میں فتویٰ نہ دے"[26]۔

لہٰذا فرقہ واریت اور شدت پسندی کے خاتمہ کے لئے ضروری ہے کہ اختلافی مسائل پر فتویٰ دینے میں احتیاط سے کام لیا جائے۔

تفردات اور اختلافی مسائل کی ترویج واشاعت:

ہر عالم و محقق کو کوئی بھی رائے اور عقیدہ رکھنے کی اجازت اور حق حاصل ہے۔ اسی طرح اہل علم کو اپنی ثابت شدہ رائے کے اظہار کا بھی حق حاصل ہے، لیکن جب اس رائے کو جو جمہور کی رائے کے خلاف ہو، معاشرے کے کل پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے اور سب لوگوں کو اس کے ماننے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور صرف اسی کی دعوت کو اوڑھنا بچھونا بنالیا جاتا ہے، تو اس سے معاشرہ تقسیم ہو جاتا ہے، اور امت میں فرقہ بندی قائم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ایک الگ مکتب فکر کی صورت میں نکلتا ہے۔

لہٰذا اگر کسی محقق کی تحقیق کسی مسئلہ میں جمہور کے مسلک کے خلاف ہو تو اس کو اپنی تحقیق کے درست ہونے کے یقین کے باوجود اس کی تبلیغ واشاعت کو مسئلہ نہیں بنانا چاہیے، بلکہ اپنی تحقیق کو علمی تحقیق تک محدود رکھنا چاہیے۔ ابن قیم فرماتے ہیں:

> ”جس رائے تک آدمی اپنے اجتہاد کے ذریعے پہنچا ہے اور جس کے بارے میں اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے کوئی نص نہیں ملی ہے، اس کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو حرام کیا ہے یا اس کو واجب اور مباح کیا ہے“[27]۔

لہٰذا علماء امت اور محققین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے مسائل جن کے بارے میں وہ جمہور سے کوئی الگ رائے اور نقطہ نظر رکھتے ہوں، اور ان کے بارے میں کوئی نص قطعی بھی موجود نہ ہو، تو ان کو ان مسائل کی تبلیغ واشاعت سے گریز کرنا چاہیے۔

اسی طرح ماضی میں علماء حق اور ائمہ مجتہدین کے درمیان جب شرعی مسائل میں اختلاف رائے ہوتا تھا، تو اس کو علمی حلقوں تک محدود رکھا جاتا تھا، اور دلائل کے ساتھ دوسرے فریق کے مسلک کا رد کیا جاتا تھا۔ کتب فقہ اور شروحات وغیرہ میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں جس میں دیانتداری سے مخالف مسلک کے مکمل دلائل بیان کر کے علمی بنیاد پر ان کا رد کیا گیا ہے۔

عصر حاضر میں شرعی مسائل بالخصوص مسلکی اختلافات میں اس روایت کی پاسداری نہیں کی گئی۔ مسلکی اختلافات کو عام اجتماعات میں موضوعِ بحث بنایا گیا اور صرف انہی اختلافی مسائل کے بیان کے لئے درس اور اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں۔ اور ان اختلافی مسائل کی گویا تبلیغ کی جاتی ہے۔

بعض شرعی اعمال میں عمل کے سلسلے میں شدت اور اس پر اختلاف:

عصرِ حاضر کے اختلافات میں ایک سبب ایک مباح یا افضل عمل، بلکہ بعض اوقات کسی بدعت پر عمل کرنے میں شدت بھی ہے۔ اگر ہم مذہبی حلقوں کے اختلافِ رائے کا جائزہ لیں تو بیشتر اختلافات جو زیادہ شدت اختیار کئے ہوئے ہیں افضل، مباح اور بدعت پر عمل کرنے کے سلسلے میں ہیں۔ ایک فریق کسی عمل کو بدعت قرار دے کر اس کی مخالفت کرتا ہے تو دوسرا فریق اسی شدت سے اس کو اسلامی عمل اور حکم ثابت کر کے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہر فریق افراط و تفریط کا مظاہرہ کرتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں ہر معاملے میں اعتدال کی تلقین کی گئی ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

> **”خیر الامور اوسطھا“**[28]
>
> ”تمام معاملات میں میانہ روی اختیار کرنا ہی بہتر عمل ہے“۔

نماز روزہ جیسے اہم احکام میں شدت پسندی کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں اعتدال کا حکم دیا گیا ہے۔

اسلام کے وہ احکام جن کی بہت زیادہ تاکید قرآن و حدیث میں بیان کی گئی ہے اور جن کے ترک پر سخت وعید آئی ہے ان میں بھی شدت کی اجازت نہیں ہے۔ تو پھر ان اعمال میں شدت اور سختی کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے جن کی نہ اس قدر تاکید ہوئی ہے اور نہ ان کے ترک پر کوئی وعید آئی ہے۔ جیسے رفع یدین، نماز کے بعد دعا اور بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھنا وغیرہ۔ اختلافات اور معاشرے پر اس کے منفی اثرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ان اعمال پر سختی اور شدت کا رویہ اختیار نہ کیا جائے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

> "یستحب للرجل ان یقصد الیٰ تالیف القلوب بترک هذه المستحبات، لأن مصلحة التالیف فی الدین اعظم من مصلحة فعل مثل هذا"[29]

> "آدمی کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ لوگوں کی تالیفِ قلب کے لئے ان مستحبات کو چھوڑ دے کیوں کہ دین میں تالیفِ قلب کی مصلحت ان کاموں کے کرنے سے زیادہ عظیم ہے"۔

وہ تمام افعال جو فی نفسہ تو جائز ہیں مگر ان کی ترتیب یا وقت میں اختلاف ہے، جیسا کہ پاکستان میں مروج رسوم و بدعات ہیں، کہ ان میں سے بیشتر میں اختلاف ترتیب اور وقت کا ہے۔ مثلاً مساکین کو کھانا کھلانا سب کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اس میں اختلاف دن کی تخصیص کا ہے، بلا تخصیص یوم اور تعین وقت سب کے نزدیک جائز اور باعث اجر و ثواب ہے۔ اسی طرح دعا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر دونوں شریعت میں مطلوب ہیں، لیکن جنازہ کے بعد دعا یا سنت اور نوافل کے بعد اجتماعی دعا اور نماز کے بعد جہری ذکر سبب اختلاف ہے۔

لہٰذا اس سلسلے میں یہ اصول اختیار کیا جائے کہ ایسا کرنے والوں پر نکیر نہ کی جائے اور نہ ان سے بحث و مباحثہ میں الجھا جائے۔ اسی طرح ان کے قائلین کو بھی چاہیے کہ جو چیز ان کے عقیدے کے مطابق بھی فرض اور واجب نہیں ہے اور وہ اختلاف اور فساد کا سبب بن رہی ہے تو اس کے کرنے پر اصرار نہ کریں اور اس کو باعث نزاع نہ بنائیں۔ اور اس سلسلے میں یہ اصول اپنائیں جو فقہ حنفی کی معتبر کتب فقہ میں بیان کیا گیا ہے کہ:

> "اذا تردد الحکم بین سنت و بدعة کان ترک السنة راجحاً علی فعل البدعة"[30]

> "جب کسی حکم میں تردد ہو جائے کہ یہ سنت ہے یا بدعت ہے تو سنت کا ترک کر دینا بہ نسبت بدعت کے کرنے کے راجح ہے"۔

اس قاعدے سے ان تمام امور کا حکم معلوم ہو جاتا ہے جس کے سنت و بدعت ہونے میں اختلاف ہو بعض اسے سنت بتاتے ہوں اور بعض اسے بدعت کہتے ہوں۔

کفر کا حکم اور فتویٰ لگانا:

عصر حاضر میں ایک افسوس ناک رجحان کسی شخص اور جماعت کے اسلام و ایمان کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار اور اس پر کفر کا حکم اور فتویٰ لگانا ہے۔ چنانچہ:

> "اپنے مسلک کا دفاع کرتے ہوئے دوسرے افراد پر کفر کا فتویٰ لگا دینا ایک معمول بن چکا ہے۔ تنگ نظری اور تعصب کی فضا میں نشو و نما پانے والے افراد کا سارا زور اس پر نہیں ہوتا کہ ان کا گروہ سچا ہے بلکہ ان کی کوشش

ہوتی ہے کہ وہ فریق مخالف کو دین سے خارج کر کے ایک اہم کارنامہ سرانجام دیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ کے کلام کی آیات کو منطق و فلسفہ کی موشگافیوں میں الجھا کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے"[31]۔

اصولاً کسی پر کفر کا حکم لگانے میں غلطی سے بہتر بات یہ ہے کہ اس کے ایمان کے حکم میں خطا ہو جائے۔ چنانچہ مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

"کسی مسلمان کو کافر کہنے کے معاملے میں آج کل ایک عجیب افراط و تفریط رونما ہے۔ ایک جماعت ہے کہ جس نے مشغلہ ہی یہ اختیار کر لیا ہے کہ ادنیٰ معاملات میں مسلمانوں پر تکفیر کا حکم لگا دیتے ہیں اور جہاں ذرہ سی کوئی خلافِ شرع حرکت کسی سے دیکھتے ہیں تو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں، اور دوسری طرف نو تعلیم یافتہ آزاد خیال جماعت ہے جس کے نزدیک کوئی قول و فعل خواہ کتنا ہی شدید اور عقائد اسلامیہ کا صریح مقابل ہو، کفر کہلانے کا مستحق نہیں"[32]۔

اس کے بعد "ضابطہ تکفیر" کے عنوان سے کفر و اسلام کا حکم لگانے کے بارے میں ایک اصول اور ضابطہ بیان کرتے ہیں کہ:

"اس لئے تکفیر کے بارہ میں ضابطہ شرعیہ یہ ہو گیا کہ جب تک کسی شخص کے کلام میں تأویل صحیح کی گنجائش ہو اور اس کے خلاف کی تصریح متکلم کے کلام میں نہ ہو، یا اس عقیدہ کے کفر ہونے میں ادنی سے ادنیٰ اختلاف ائمہ اجتہاد واقع ہو، اس وقت تک اس کے کہنے والے کو کافر نہ کہا جائے"[33]۔

اس لئے فقہاء نے کفر اور اسلام کا فیصلہ کرنے کے بارے میں انتہائی احتیاط برتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

"اذا كان في المسئلة وجوه توجب الكفر و وجه واحد يمنع فعلى المفتي ان يميل الىٰ ذلك الوجه"[34]

"جب کسی مسئلہ میں زیادہ موجبات کفر ہوں اور کفر سے بچنے کی صرف ایک وجہ موجود ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ وہ اس ایک وجہ کو جو کفر سے بچاتی ہے ان متعدد وجوہ پر ترجیح دے جو کفر کو لازم کرتی ہیں"۔

لہٰذا کسی پر کفر کا حکم اور فتویٰ لگانے میں نہایت احتیاط کرنا چاہیے۔ اس میں بیباکی اور جلد بازی سے کام لینا نہایت خطرناک بات ہے۔ کیونکہ اگر جس پر کفر کا حکم لگایا گیا وہ فی الواقع اس کا مصداق نہیں ہے تو حسبِ تصریح حدیث شریف اس کہنے والے کے کفر کا اندیشہ ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"اگر کوئی آدمی کسی کو کفر کے ساتھ پکارتا ہے یا اللہ کا دشمن کہتا ہے اور وہ ایسا نہیں ہے، تو اس قسم کا کلمہ کہنے والے پر لوٹتا ہے"[35]۔

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

"من قال لأخيه يا كافر فقد باء بهما احدهما"[36]

"جس نے کسی مسلمان بھائی کو کافر کہا اگر وہ فی الواقع کافر ہے تو ٹھیک، ورنہ کہنے والے کا قول اس کی طرف لوٹ جاتا ہے"۔

ایک اور روایت میں ہے:

"عن ابن عمر رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ أیما رجل مسلم أکفر رجلا مسلماً فان کان کافرا و الا کان هو الکافر"[37]

"جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہتا ہے اور وہ واقع میں کافر نہیں ہوتا تو کہنے والا خود کافر ہو جاتا ہے"۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ علماء مسلمین کو محض غلطیوں کی بنا پر کافر کہنا درست نہیں ہے، بلکہ محض غلطیوں کی وجہ سے تو عامۃ المسلمین کو بھی کافر کہنا اور قرار دینا جائز نہیں ہے۔"[38]۔

لہٰذا اس سلسلے میں ضروری ہے کہ یہ اصول اختیار کیا جائے کہ اگر کسی مسلک کے کسی عالم کی کتاب میں کوئی ایسی اختلافی بات یا عبارت موجود ہے جس پر دوسرے مسلک کے علماء کو اعتراض ہے اور ان کے نزدیک ایسی بات کفر کے زمرے میں آتی ہے تو اس عبارت کی وضاحت اور تشریح کا حق اسی مصنف کو دیا جائے یا اس کے مسلک کے کسی معتبر عالم سے اس کی تشریح کرائی جائے۔ اور پھر اس کی وضاحت اور تفصیل کو قبول کر لیا جائے۔ اس طرح اختلافات کی شدت کو اگر ختم نہیں کیا جا سکتا تو کم ضرور کیا جا سکتا ہے۔

اس مضمون میں چند اہم مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے جو مقامی سطح پر فرقہ واریت اور شدت پسندی کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ علم، محققین اور بالخصوص دینی جماعتوں اور اداروں سے وابستہ علماء کرام ان مسائل پر غور فرمائیں اور فرقہ واریت اور شدت پسندی کے خاتمے کے لئے اپنے مؤثر کردار ادا کریں تاکہ اسلام اور پاکستان مخالف عناصر کو اپنے عزائم کی تکمیل کا موقع نہ مل سکے۔

حواشی وحوالہ جات:

[1] اصفہانی، امام راغب، المفردات فی غریب القرآن، دمشق، دار القلم، ج:۱، ص ۶۱۳۔

[2] آزاد، ابو الکلام، مولانا، ترجمان القرآن، لاہور، اسلامی اکادمی، ۱۹۷۶، ج ۱، ص ۴۰۴۔

[3] اصلاحی، امین احسن، مولانا، تدبر قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۳، ج ۱، ص ۴۳۴۔

[4] سورۃ النساء، آیت: ۱۷۱۔

[5] الحاکم، ابو عبد اللہ الحاکم محمد بن عبد اللہ، المستدرک علی الصحیحین، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ط: اول ۱۴۱۱ھ، ج:۱، ص ۶۳۷۔

[6] امام مسلم، مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب العلم، رقم الحدیث ۲۶۷۰۔

[7] امینی، محمد تقی، احکام شریعت میں حالات و زمانہ کی رعایت، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن، ص: ۶۸،۶۹۔

[8] محمد شفیع، مفتی، وحدت امت، لاہور، مکتبہ انجمن خدام القرآن، س ن، ص ۲۸۔

[9] ایضاً، ص ۲۲۔

[10] مختار الدین، شاہ، مفتی، عصر حاضر میں دینی اختلافات، کراچی، مکتبہ الایمان، س ن، ص ۶۔

[11] ابن نجیم المصري، زین الدین بن ابراھیم بن محمد، البحر الرائق شرح کنز الدقائق، بیروت، دار الکتاب الاسلامی، ط ثانی، س ن، ج ۲، ص ۲۱۔

[12] شامی، محمد امین ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، بیروت، دار الفکر، طبع ثانیہ، ۱۴۱۲ھ، ج ۱، ص ۴۸۔

[13] ابن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد، امام، المصنف، بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۴، ج ۷، ص ۴۰۲۔ نیز امام بیہقی، السنن الکبریٰ، ج ۶، ص ۲۲۳۔

[14] سرخسی، محمد بن احمد، امام، اصول السرخسی، بیروت، دار المعرفۃ، س ن، ج ۲، ص ۱۰۷۔

[15] ابو داؤد، سلمان بن اشعث، امام، سنن ابی داؤد، باب فی الھوی، ج ۴، ص ۳۳۴۔ حدیث: ۵۱۳۰۔

[16] حبیب الرحمن، ڈاکٹر، فقہی اختلافات، اسلام آباد، شریعہ اکیڈمی، طبع دوم، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۹۔

[17] صدیقی، محمد مظہر یسین، عہدِ نبوی ﷺ میں اختلافات، لاہور، دار النوادر، ۲۰۱۴ء، ص xii، مقدمہ۔

[18] محمد زکریا، شیخ الحدیث، الاعتدال فی مراتب الرجال، لاہور، مکتبہ زکریا، س ن، ص ۲۲۹۔

[19] المرجع السابق، ص xi۔

[20] ابن قیم، اعلام الموقعین، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ط اول، ج ۱، ص ۲۷۔

[21] ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، ج ۳، ص ۳۲۱، حدیث: ۳۶۵۷۔

[22] محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، کراچی، ادارۃ المعارف، ط: جدید، ۱۹۹۴، ج ۳، ص ۳۶۵۔

[23] آفندی، علی حیدر خواجہ، درر الحکام فی شرح مجلۃ الاحکام، بیروت، دار الجیل، ط: اول، ۱۴۱۱ھ، ج ۴، ص ۶۱۸۔

[24] ابو بکر البیھقی المدخل الیٰ السنن الکبری، کویت، دار الخلفاء، ج ۱، ص ۴۳۲۔

[25] ابو العباس قرافی، احمد بن ادریس، الاحکام فی تمیز الفتاویٰ عن الاحکام و تصرفات القاضی و الامام، مترجم ڈاکٹر حافظ غلام یوسف، اسلام آباد، شریعہ اکیڈمی، اشاعت اول، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۷۔

[26] ایضاً، ص ۲۸۷۔

[27] ابن قیم، محمد بن ابو بکر بن ایوب، اعلام الموقعین، بیروت، ادار الکتب العلمیۃ، ط اول، ۱۴۱۱ھ، ج ۱، ص ۴۴۔

[28] اصبھانی، عبد اللہ بن محمد، ابو محمد، کتاب الأمثال فی الحدیث النبوی، بمبئ، الدار السلفیۃ، ط ثانی، ۱۹۸۷، ج ۱، ص ۴۱۷۔

[29] امام ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، مجمع فہد الملک، ۱۴۱۶ھ، ج ۲۲، ص ۴۰۷۔

[30] ابن نجیم المصري، زین الدین بن ابراھیم بن محمد، البحر الرائق شرح کنز الدقائق، بیروت، دار الکتاب الاسلامی، ط ثانی، س ن، ج ۲، ص ۲۱۔

[31] جامی، نور الدین، ڈاکٹر، پروفیسر، معارف اسلامی، ج ۶، شمارہ ۲، جولائی ۲۰۰۷ء، (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد)۔

[32] محمد شفیع، مفتی، جواہر الفقہ، کراچی، مکتبہ دار العلوم، طبع جدید، ۱۴۲۳ھ، ج: ۱، ص: ۳۴۔

[33] ایضاً، ص ۳۶۔

[34] ابو الولید الحلبی، احمد بن محمد بن محمد، لسان الحکام فی معرفۃ الاحکام، قاہرہ، مکتبہ الحلبی، ط ثانی، ۱۳۹۳ھ، ج ۱، ص ۴۱۴۔

[35] امام مسلم، محمد بن مسلم، صحیح مسلم، حدیث ۶۱۔

[36] امام بخاری، صحیح بخاری، ج ۲، ص ۱۹۷، حدیث نمبر ۱۴۰۵۔

[37] امام ابو داؤود، سنن ابی داؤود، باب الدلیل علیٰ زیادۃ الایمانِ و نقصانہ، حدیث نمبر ۴۶۸۷۔

[38] ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، ج ۳۸، ص ۱۰۰۔